نردبان
وزیر آغا

نردبان

وزیر آغا

مکتبۂ اُردو زبان

ضابطہ

حقوق	بحق مصنف محفوظ
طبع	اوّل
ناشر	نصرت انوار
مطبع	مکتبہ جدید پریس لاہور
سرورق	اسلم کمال
خطاطی	تمکین شیرازی
ماہ وسالِ اشاعت	جنوری ۱۹۷۹ء
قیمت	۱۵ روپے

مکتبہ اُردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا

یوسف ظفر کی یاد میں

"کون اب لکھے گا شام کے ماتھے پہ تیرا نام"

مُصنّف کے دوسرے شعری مجموعے

شام اور سائے	(نظمیں)
دن کا زرد پہاڑ	(نظمیں اور غزلیں)
غزلیں	(غزلیں)

ترتیب

نردبان — وزیر آغا	۷	اگر ازل سے یہی چلن ہے	۴۷
دُعا	۱۷	ہُوا کہتی رہی آؤ	۴۹
بیکراں وسعتوں میں تنہا	۱۹	نشترگاہ	۵۱
ازل سے ابد تک	۲۲	سمندر اگر میرے اندر گرے	۵۳
دیواریں	۲۵	اشومیدھ یگیہ	۵۵
دُھوپ	۲۷	اک تنہا بے برگ شجر	۵۷
ناصح	۲۹	دست بستہ کھڑا ہوں	۵۹
عجیب ہے یہ سلسلہ	۳۲	آویزش	۶۲
ایک خواب	۳۵	جب آنکھ کھُلی میری	۶۴
ناموجُود کے بھاری دَر پر	۳۹	وہ اک تازہ شے	۶۷
ذات کے روگ میں	۴۱	سلومی	۶۹
ہَوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے	۴۳	ٹین کا ڈبہ	۷۱
وَاپسی	۴۵	ہوا اگر میرا روپ دھارے	۷۳

سفر کا دوسرا مرحلہ ۷۵
کہانی ۷۷
بھوری مٹی کی تہہ کو ہٹائیں ۸۰
اُس کے دُشمن ۸۲
آمد ۸۴
اِک سیال سونے کا — ساگر ۸۷
سُورج کے آنے سے پہلے ۸۹
دُکھ میلے آکاش کا ۹۱
حادثہ ۹۳
برف ۹۵
بُجھی راکھ کا اُنگ ۹۷
سیلِ بلا ۹۹
اِک نقش پیارا ۱۰۱
آنکھ بھنور کی ۱۰۳
انسان ۱۰۵

نَردبان!

"نَردبان!" —— میری نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ نَردبان، فارسی کا لفظ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے زینہ یا سیڑھی اور اصطلاحی مفہوم ہے رفعت یا مرتبۂ بلند! بظاہر اس لفظ کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم میں مدارج کا فرق محسوس ہوتا ہے کیونکہ زینہ بہرحال بلندی تک رسائی پانے کا محض ایک ذریعہ ہے لیکن شاعری کے ضمن میں یہ دونوں مفاہیم ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں کیونکہ شاعری بیک وقت ذریعہ بھی ہے اور حاصل بھی۔ اسے ذریعہ اور حاصل میں شعوری طور پر بانٹنے کی کوشش اُن لوگوں نے کی ہے جو شاعری کو مقصدیت کے تابع کر دینے کے حق میں ہیں اور اس سے بالکل اُسی طرح کام لینا چاہتے ہیں جیسے مثلاً ایک کاریگر جو زینے کو دیوار پر قلعی کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ حالانکہ شاعری اگر کسی خارجی مقصد کے تابع کر دی جائے تو اس کا وہ منصب بُری طرح مجروح ہو گا جو سیاحتِ قلب کے مترادف ہے اور جس کے دوران میں خود شاعر ایک انوکھے جہانِ رنگ و بُو کو دریافت کرتا ہے۔ دریافت ہی نہیں کرتا اسے صورت بھی عطا کرتا ہے مگر غور کیجئے کہ شاعری میں دریافت کا عمل وجود میں آتا ہے اور دریافت کا عمل ہی صورت گری کر پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کو منہا کر دینے سے دوسرا تشنۂ تکمیل

رہ جاتا ہے۔ اپنے مجموعے کے لئے "نزد بان" کو بطور عنوان منتخب کرتے وقت میرے پیش نظر شاعری کا یہی جوہر تھا جو بیک وقت اظہار بھی ہے اور ابلاغ بھی۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کروں گا کہ "نزدبان" کی نظمیں اس جوہر کو متشکل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں البتہ اس بات کا اظہار یقیناً مقصود ہے کہ یہ نظمیں شاعر کی ذات کو متشکل کرکے اسے پہچاننے کی کوشش ضرور ہیں۔ میں نے جب بھی کوئی نظم لکھی ہے تو اس نے مجھے اپنے "اندر" کی شکست و ریخت یا تعمیر و تشکیل کا ایک ایسا منظر دکھایا ہے جو کسی تجزیاتی عمل کی مدد سے کبھی دکھائی نہ دیتا۔ لہٰذا میں کئی بار سوچتا ہوں کہ یہ نظمیں میرے دل ساگر کے جوار بھاٹے کی ایک داستان بھی ہیں اور اگر کبھی مجھے اپنی سوانحِ عمری لکھنے کی ضرورت پڑی (جس کا امکان بہت کم ہے) تو میں بآسانی ان نظموں کی مدد سے اسے مرتب کرسکوں گا۔ یوں ان نظموں کا قاری ان کے قریبی مہیجات کے بارے میں بھی جان سکے گا اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات یا زمانے کی بڑی بڑی کروٹوں کی قلب ماہیت کا نظارہ بھی کرسکے گا جس کے نتیجے میں نظم سے لطف اندوز ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

مثلاً پچھلے دنوں جب میں بیمار پڑا اور دوائیوں اور ڈاکٹروں کی مختلف اور متنوع اقسام سے نبرد آزما ہو چکا تو میں نے سوچا کہ اپنے شہر کے مشہور معالج اور نباض سے رجوع کروں۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی شخصیت کا ایک گہرا تاثر میں نے فوری طور پر قبول کیا۔ ان کے بارے میں مجھے یہ علم تو ہو چکا تھا کہ وہ پچھلے کئی برس سے صرف اشاروں میں یا لکھ کر دوسروں سے ہم کلام ہوتے ہیں اور گفتگو کے وسیلے کو ترک کر چکے ہیں مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ایسی پُراسراری کیفیت میں مبتلا ہوں گے جس میں پوری شخصیت پانی میں شکر کی طرح تحلیل ہو جاتی ہے۔ میں جب انہیں ملا تو ان کی زبان پر آیات قرآنی کی مہک تھی۔ انہوں نے میری نبض پر اپنی انگلی رکھی اور پھر آنکھیں میچ کر انتہائی جذب کے عالم

میں چلے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک کاغذ پر اپنی تشخیص کا نتیجہ لکھا اور کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پڑھا تو حیران رہ گیا کیونکہ انہوں نے میرے روگ کی سو فی صد صحیح تشخیص کر دی تھی۔

اس واقعے کے کئی روز بعد اچانک ایک صبح میرے احساسات میں ایک کہرام سا برپا ہوا اور کوئی کیفیت یا اسرار لفظوں میں منتقل ہونے کے لئے شور مچانے لگا۔ مجھے نظم کی آمد کی اطلاع ہمیشہ اس کیفیت یا اسرار نے دی ہے اور پھر نظم لفظوں میں منتقل ہو کر کاغذ پر اُترتی چلی آئی ہے۔ اس بار جب قلم نے لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے نبّاض کا سراپا اُبھرا، پھر اس عمل کی نقاب کشائی ہوئی جس کی مدد سے نبّاض نے میرے روگ کی تشخیص کی تھی۔ مگر اس کے بعد نظم کی باگ ڈور میرے ہاتھ سے نکل گئی اور جب نظم مکمل ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران ہُوا کہ اس میں میرا روگ، نبّاض کے اپنے روگ کے مقابل ایک آئینہ کی صُورت موجُود تھا۔ دونوں روگ ایک دوسرے کو کروٹ دے رہے تھے اور مجھ پر یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ روگ اُس نغمے کی طرح نہیں ہوتا جسے گراموفون ریکارڈ کی لکیروں میں قید کر لیا جاتا ہے بلکہ اُس کی حیثیت تو ایک ایسے آئینہ کی سی ہے جو صدیوں تک کسی پتھر کی طرح بے حس اور بے عکس پڑا رہتا ہے۔ مگر جب کسی دوسرے کے روگ کو سامنے پاتا ہے تو سو رنگوں میں خود کو منعکس کرنے لگتا ہے گویا جی اُٹھتا ہے۔ نظم درج ذیل ہے:

"نبّاض"

روگ

باہر کی طرف آئے

تو چہرے پہ لکیریں اُس کی

یُوں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ اُبھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں!
میں نے نبّاض سے پوچھا کہ مرے روگ کی صورت کیا ہے؛
(کیسا نبّاض ہے وہ — بات تو کرتا ہی نہیں
اُس کے ہونٹوں پہ ہمکتی ہوئی آیات مگر
اُس کے اندر کسی شَے کا پتہ دیتی ہیں)
اُنگلیاں اُس نے مری نبض پہ رکھ دیں تو معاً
اُس کے ہونٹوں پہ ہمکتی ہوئی آیات کا کُہرام اُٹھا
اور چہرے کی لکیروں نے دہن کھول دیئے
اُس نے کاغذ پہ لکھا: روگ تمہارا یہ ہے!
میں نے کاغذ پہ لکھا: روگ تمہارا بھی تو میرے ہی سجل روگ کا آئینہ ہے!
اور پھر آئینے اِک دوسرے کو دیکھ کے حیران ہوئے
اپنے روگوں کے نگہبان ہوئے!

روگ باہر کی طرف آئے تو چہرے پہ لکیریں اس کی
یوُں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ اُبھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں
گرم شہروں کی اُدھڑتی ہوئی سڑکوں کی طرح
اور اُن کھیتوں کے مانند جو اپنے ہی پسینے میں شرابُور
مکانوں کی غلاظت میں دھنسے اُجلے مکینوں ایسے
نبض پر انگلیاں رکھے میں کھڑا ہوں کب سے

جانتا ہوں کہ اگر میں نے کسی پُرزے پہ کچھ لکھا تو وہ
اُسی کاغذ پہ اُگل دے گا وہ سب کچھ
جو مرے دُکھتے ہوئے جسم کے ہر انگ میں ہے
میرے سینے کے نہاں خانۂ صد رنگ میں ہے،

روگ آواز نہیں ہے، کہ اسے گہری لکیروں میں کوئی بند کرے
اور پھر نبض پہ انگلی رکھ کر
اِک گھِسے نغمے کی بیٹھی ہوئی سِسکار سُنے
روگ آئینے کی صورت ہے — اسے کوئی اگر
رُو برو لائے تو سو رنگ میں لَو دیتا ہے
ورنہ پتھر ہے کہ صدیوں سے پڑا ہے بے حس
زنگ اور دھُول کی چادر میں چھُپائے خود کو
اپنے اندر کی غلاظت سے سجائے خود کو

تجربے کی یہ قلب ماہیت کسی شعوری اقدام کا ثمر کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے تو سونے جاگنے اور ہونے نہ ہونے کا وہ عالم درکار ہے جس میں انسان منقطع بھی ہوتا ہے اور وابستہ بھی، بے نیاز بھی اور مبتلا بھی۔ وہ لاشعوری بہاؤ کی زد پر بھی ہوتا ہے اور شعور کی دہلیز پر بھی۔ فن کی تخلیق کا سارا عمل اصلاً قصّہ ہے سوتے جاگنے کا۔ اسے محض لاشعوری یا محض شعوری اقدام کہنا صحیح نہیں۔

میرا مؤقف یہ ہے کہ پس منظر سے آگاہی نظم سے لطف اندوز ہونے کے عمل کو مہمیز لگاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قاری تجرید کی فضا میں بالا بالا اُڑ جانے کے بجائے اپنی جُملہ حسیات کی مدد سے اُس ارضی ماحول کو محسوس کرتا ہے جو نظم کا عقبی دیار بھی ہے اور اس کا منبع اور مخرج بھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ قاری کو ہر نظم کے عقبی دیار کا علم نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود شاعر اُس کی رہنمائی نہ کرے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ خود شاعر اپنی زندگی کی کہانی کے محسوساتی رُخ کو یوں قلمبند کرے کہ اس کی ہر نظم کا سیاق و سباق ایک حد تک روشن ہو جائے یا پھر شاعر کے ساتھ شام منانے کی روایت میں یوں تبدیلی کی جائے کہ اُسے سامنے بٹھا کر اُس پر مدح اور خوشامد کے پھُول برسانے کے بجائے شاعر سے صرف یہ فرمائش کی جائے کہ وہ اپنی نظمیں سُنائے اور ساتھ ساتھ ان کے عقب میں پھیلے ہوئے اپنے تجربات کے خدوخال بھی دکھاتا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خود نظم اپنے عقبی دیار اور اس کے ارضی مظاہر سے اس درجہ منسلک ہو کہ قاری کو شاعر کے تجربے میں شرکت کا موقعہ مِل سکے۔ مجید امجد کی یہی خوبی دامن کشِ دل ہے کہ وہ اشیاء اور مظاہر کے ارضی نقوش سے قاری کو آشنا کرتا ہے تاہم اُسے ان اشیاء اور مظاہر کے ہالے میں قید کرنے کے بجائے ان سے اُوپر اُٹھنے کی ترغیب بھی دیتا ہے مگر اس طور نہیں کہ نظم کا مطالعہ کرنے والا کسی ہوائی جہاز میں سوار ہو کر آسمان سے زمین پر ایک نگاہ ڈالے بلکہ یوں کہ وہ کسی ٹیلے یا پہاڑ کی چوٹی پر سے اِرد گرد کے ماحول کو دیکھے۔ مراد یہ کہ اُس کے پاؤں زمین کے ساتھ ضرور جُڑے رہیں ورنہ اُس کی مُٹھی کی گرفت سے وہ سارا عقبی دیار پھسل جائے گا جس کا لمس شاعری کی اساس اور بنیاد ہے۔

ابھی میں نے نظم کے عقبی دیار کا ذکر کیا مگر اس سِلسلے میں ایک ضروری احتیاط کی طرف بھی اشارہ کر دوں۔ نقطہ یہ ہے کہ عقبی دیار سے آگاہی بیک وقت ایک مثبت قدم بھی ہے اور

منفی بھی، مثبت یوں کہ قاری شاعر کے حسّی تجربے میں فی الفور شریک ہو جاتا ہے اور اس کے لئے نظم سے لطف اندوز ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ منفی یوں کہ اگر وہ خود کو محض اس واقعہ تک محدود رکھے جس کا علم شاعر کی وساطت سے اُسے ہوا ہے اور اُس معنوی پرچھائیں سے کوئی سروکار نہ رکھے جو ہر اچھی نظم کے بطن سے پھوٹتی ہے تو ظاہر ہے کہ نظم کی تہہ در تہہ کیفیات سے وہ آشنا نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا عقبی دیار سے شناسائی صرف تجربے میں شرکت کی حد تک ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد قاری خود ان جہات میں سفر کرے جو روشنی کی شعاعوں کی صورت میں نظم کی قندیل سے باہر کو لپکتی ہیں۔ اگر ایسا ہو تو وہ نظم کے عقبی دیار کو اپنے پاؤں تلے محسوس کرنے میں کامیاب ہوگا بعینہٖ جیسے کوہ پیما پہاڑ کی چوٹی پر پاؤں رکھ کر چاروں طرف پھیلی ہوئی وادیوں کو دیکھتا ہے۔ نظم کی پرکھ کے سلسلے میں بھی اس بات کو بغور دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ٹھوس تمثالیں CONCRETE IMAGES کا کیا عالم ہے کیونکہ ٹھوس تمثالیں عقبی دیار کے ارضی نشانات ہیں جو شاعر کے حسّی تجربے کے خدوخال کو اُجاگر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اس بات پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ کیا نظم ان حسّی تجربات کو بنیاد بنا کر اُوپر کی طرف اُٹھ بھی رہی ہے یا نہیں یعنی وہ محض حسّی تجربات تک محدود ہے یا معنی کی اَن گنت پرچھائیوں اور شعاعوں کو جنم بھی دے رہی ہے؛ ہر اچھی نظم کی دو سطحیں ہوتی ہیں — ایک ارضی سطح جو ٹھوس اور محسوس تمثالوں میں متشکل ہوتی ہے۔ دوسری معنوی سطح جو امکانات کے دَر وا کر دیتی ہے۔ مگر امکانات کی صورت تبھی ممکن ہے کہ شاعر اور پھر قاری پہلے اپنے تجربے کے اندر سفر کرے اور پھر تجربے سے نکلنے والی شعاعوں پر محوِ خرام ہو۔ تجربے کے بطون میں سفر کرنے کے لئے نظم کے عقبی دیار سے آگاہی ضروری ہے اور یہ آگاہی شاعر کی وساطت سے بھی ہو سکتی ہے اور نظم کی ٹھوس تمثالوں کے ذریعے بھی مؤخر الذکر طریق ایک آزمودہ نسخہ ہے مگر مقدم الذکر کو اپنی کارکردگی

کا مظاہرہ کرنے کے لئے زیادہ مواقع مہیا نہیں کئے گئے. کیا ہرج ہے اگر منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اس طریق کو بھی آزما لیا جائے۔

واضح رہے کہ نظم میں ٹھوس اور محسوس تمثالوں کی موجودگی خود تجربے کی موجودگی پر دال بھی ہے۔ اُردو شاعری میں ایسی نظموں کی کمی نہیں جن میں ارض کے ساتھ شاعر کا جسمانی تعلق نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک تجریدی یا نظریاتی فضا کا باسی ہے اور ارضی اشیا کو محض فاصلے سے دیکھنے پر ہی اکتفا کرتا ہے یعنی انہیں اپنے حسّی تجربے کے دائرے میں نہیں سمیٹتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ نظم کا خیال تجربے کے لمس سے محروم ہو کر محض تجریدیت کا حامل ہو کر رہ جاتا ہے مشہور نیورو سرجن ڈاکٹر وائلڈر پن فیلڈ Dr WILDER PENFIELD نے انسانی دماغ کی کارکردگی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے ٹیپ ریکارڈ پر صرف انہیں اشیا، مظاہر یا واقعات کی یادیں محفوظ ہوتی ہیں جن کو انسان نے کسی نہ کسی وجہ سے اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا تھا اور وہ لاتعداد تاثرات جو انسان ہر لحظہ اپنی حسیات کے ذریعے حاصل کرتا ہے، دماغ کے شعبۂ یادداشت میں ریکارڈ نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک کوئی شے یا مظہر انسانی تجربے کا حصّہ نہ بن جائے (یعنی مکمل ارتکاز سے انسان کی گرفت میں نہ آ جائے) وہ دماغ کے شعبۂ یادداشت میں محفوظ نہیں ہو سکتا۔ پن فیلڈ نے دوسری اہم بات یہ کہی ہے کہ واقعہ یا شے اپنے متعلقہ محسوسات سمیت دماغ میں محفوظ ہوتی ہے۔ چنانچہ جب تجربات کے دوران میں مریض کے دماغ کے اُس حصّہ کو چھیڑا گیا جس میں کوئی یادداشت محفوظ تھی تو مریض نے اس واقعہ کو جس سے یہ یاد وابستہ تھی، اُسی طرح محسوس کیا جیسے اس نے واقعی زندگی میں اوّل اوّل اسے محسوس کیا تھا۔ گویا یاد محض تصویر کے طور پر نہیں بلکہ اپنے لمس، خوشبو، آواز اور ذائقہ کے ہمراہ نمودار ہوئی۔ نیز اس کے ساتھ وہ ساری احساسی اور جذباتی فضا بھی دوبارہ سامنے آ گئی جس سے اوّل اوّل مریض

گزرا تھا۔ ان تحقیقات کی روشنی میں اگر ورڈز ورتھ کے اس مؤقف کو سامنے رکھ کر سوچیں کہ "شاعری نام ہے توانا محسوسات کے قدرتی بہاؤ کا۔ یہ اُن جذبات سے جنم لیتی ہے جن کی ایک حالت سکون میں بازیابی کی گئی ہو۔ مگر پھر آہستہ آہستہ سکون کی حالت باقی نہیں رہتی اور ویسے ہی توانا محسوسات پیدا ہو جاتے ہیں" تو محسوس ہوگا کہ ورڈز ورتھ کا یہ نظریہ دماغ کی کارگزگی کے بارے میں جدید ترین تحقیقات کے عین مطابق ہے اور یوں اسے ایک سائنسی بنیاد مہیا ہوگئی ہے۔ میرے خیال کو اس بات سے تقویت یوں ملتی ہے کہ جب تک نظم میں اُبھرنے والی ٹھوس اور محسوس تمثالیں تجربے کے بطن سے نہ پھوٹیں ان کی حیثیت ایک کلیشے سے مختلف نہیں ہوتی۔ لہٰذا نظم اپنی سچائی کا اوّلین ثبوت اُن ٹھوس تمثالوں سے دیتی ہے جو قاری کے ہاں بازیافت کی اُس کیفیت کو پیدا کریں جس کا ورڈز ورتھ نے ذکر کیا یعنی یاد اپنے محسوساتی دائرے سمیت وارد ہو۔ دراصل شاعری کا معرضِ وجود میں آنا اُسی طرح ہے جیسے کوئی شخص دریا کے تیز بہاؤ کی زد میں ہو اور پھر وہ کسی نہ کسی طرح کنارے کی کسی چٹان، جھاڑی یا گھاس پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے خود کو دریا کے بہاؤ سے الگ کرے اور پھر دریا سے باہر آ جائے۔ شاعر بھی محسوسات کے دریا میں بہتے ہوئے ایسے ٹھوس تصوّرات کا طالب ہوتا ہے جو اُسے باہر نکلنے میں مدد دیں یعنی اُسے نیست سے ہست میں لائیں اور تجرید کو تجسیم میں تبدیل کر دیں۔ تجسیم کا عمل بقائے ذات کی صورت بھی ہے کہ احساس کو جسم عطا کرتا ہے اور یوں اس کی پہچان ممکن ہو جاتی ہے۔ ڈوبتے ہوئے شخص کا چٹان یا جھاڑی کو پکڑ کر دریا سے باہر آنا ایک زبردست تجربہ ہے کہ موت کے لمس سے جاگتا ہے اور شدید ارتکاز کو جنم دیتا ہے۔ اسی طرح جب شاعر کے ہاں محسوسات کے بہاؤ میں ٹھوس تمثالیں چٹان یا جھاڑی ایسا سہارا بن جاتی ہیں تو ان میں شاعر کے سارے محسوسات مرتکز دکھائی دینے لگتے ہیں یعنی محفوظ ہو

جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ احساس کے صورت پذیر ہونے کے عمل ہی میں احساس کی بقا ہے ورنہ وہ تحلیل ہو کر فنا ہو جائے گا. میں نے جب بھی کسی نظم کا مطالعہ کیا ہے تو اس کی ٹھوس تمثالوں کی موجودگی اور سچائی ہی کو نظم کی سچائی کا میزان گردانا ہے. یہ بنیادی بات ہے. اس کے بعد اگر نظم معنویت کی پرتیں بھی کھولتی چلی جائے تو اس نقاب کشائی کی نسبت ہی سے اس کی اہمیت متعین ہو گی. مگر سچی ٹھوس تمثالیں بہر حال نظم کا کچا مواد ہیں. بعینہٖ جیسے رنگ مصور کے لئے اور سُر موسیقار کے فنی اظہار کے لئے بنیادی عناصر کا درجہ رکھتے ہیں.

بات بلا ضرورت پھیل رہی ہے. لہٰذا اس کے پَر قطع کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ اگر "نردبان" کا قاری نظموں کی ٹھوس تمثالوں کو عقبی دیار کے خدّوخال قرار دے کر خود بھی ان کی مدد سے عقبی دیار کو دریافت کرنے کی کوشش کرے تو وہ شاید ارضی سطح پر بھی ان سے لطف اندوز ہو سکے گا اس کے بعد اگر وہ نظموں کے اُفقی دیار کی طرف بھی پیش قدمی کرے تو شاعر کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں!

وزیر آغا

وزیر کوٹ

یکم جنوری ۱۹۷۹ء

دُعا

بیاضِ شب و روز پر دستخط تیرے قدموں کے ہوں
بدن کے پسینے سے قرنوں کے اوراق مہکیں
صبا تیرے رستے سے کنکر ہٹائے
فلک پر گرجتا ہوا گرم بادل
ترے تن کی قوسِ قزح کا
لرزتا، دمکتا ہوا کوئی منظر دکھائے
تجھے ہر قدم پر ملیں منزلیں
ہوا کے ایک باریک سے تیز چابک کی صورت
تری بند مُٹھی میں دبکی رہے
سدا تجھ کو حیرت سے دیکھے زمانہ
تُو بہتے ہوئے تیز دھاروں کی منزل بنے
بادباں سارے تیری ہی جانب کُھلیں
اور اُفق کی منڈیروں پہ کُونجوں کی لمبی قطاریں

تری منتظر ہوں

اگر میں زمیں کے سیہ تنگ پاتال میں گر بھی جاؤں تو کیا ہے
مجھے تو زمیں کورے کاغذ کی صورت ملے
بیاضِ شب و روز پر دستخط تیرے قدموں کے ہوں
چھپکتے ہوئے تینوں نٹ کھٹ زمانے
ترے گرد ناچیں
تو ہنسی کی تانوں سے ہر شے کو پاگل کرے، نذرِ آتش کرے
توڑ ڈالے
مگر خود نہ ٹوٹے
کبھی تو نہ ٹوٹے!!

بیکراں وسعتوں میں تنہا!

سفر میں ہوں اور رُکا کھڑا ہوں
میں چاروں سمتوں میں چل رہا ہوں مگر کہاں ہوں؟
وہیں — جہاں سُرخ روشنائی کا ایک قطرہ
کسی قلم کی کثیف نِب سے ٹپک پڑا ہے!
میں خود بھی شاید کسی قلم سے گرا ہوا ایک سُرخ قطرہ ہوں
زندگی کی سجل جبیں پر چمکتی بندیا سی بن گیا ہوں
مگر میں بندیا نہیں ہوں شاید کہ وہ تو تقدیس کا نشاں ہے
دلوں کے دھاگوں کی اِک گرہ ہے
گرہ — جو صدیوں میں بننے والے حسین رشتوں کا آشرم ہے
جو آنے والی تڑپتی صدیوں کی ابتدا ہے
گرہ تو جنکشن ہے پٹڑیوں کا، مسافروں کا، نئی نویلی رفاقتوں کا
محبتوں کا، اذیتوں کا

مگر میں تنہا ہوں — بے کراں وسعتوں میں تنہا!
سفید ماضی، سفید فردا، سفید یہ لمحۂ عبادت
کہ جس پہ کوئی نہیں عبارت
سفید ماتھے پہ سُرخ دھتبہ ہوں
ابتدا، انتہا کے دھاگوں سے کٹ چکا ہوں!

مَیں سُرخ دھتبہ ہُوں
کپکپاتے لطیف عکسوں کا سلسلہ ہوں
تمام چہرے جو تیرے اندر سے جھانکتے ہیں
مرے ہی چہرے کی جھلکیاں ہیں
مرے ہی سینے کی دھڑکنیں ہیں
یہ تیز رنگوں کے تُند دریا
جو دُکھ کے کوہِ گراں سے رِس کر
زمیں کی بنجر، اُداس سی سلطنت کو چھُو کر
اس ایک بے انت سُرخ نقطے کے بحرِ ظلمات میں گرے ہیں
مرے ہی بے نام دست و پا ہیں!
یہ جگمگاتی سی کہکشائیں جو ابتدا سے
خلا کی ظُلمت میں قید باہر کو اُڑ رہی ہیں،
گرہ ہیں بنی ہیں

وہیں کھڑی ہیں

وہیں — جہاں سُرخ روشنائی کا ایک قطرہ
کسی قلم کی کثیف نِب سے ٹپک پڑا ہے
وہ ایک قطرہ جو میرا دِل ہے
جو میرے عکسوں کا سلسلہ ہے
جو میرے ہونے سے سُرخرو ہے
جو میری پابستہ آرزُو ہے!

ازل سے ابد تک

پرندہ ہَوا ہے
ہَوا سانس ہے
سانس چھاتی کے پنجرے میں آنے کا
اور لَوٹ جانے کا اِک سِلسلہ ہے
میں اس سِلسلے کے پُراسرار سے زیر و بم میں رواں ہوں
مسافت کے دریا میں، موجوں کی زَد پر
ہواؤں کی ٹھوکر پہ آیا ہُوا اَبر کا ایک بجرا ہوں
بجرے کا تنہا مُسافر ہوں
دریا کے دونوں کناروں میں سیّال سا رابطہ ہوں
ازل سے ابد کی طرف
اور ابد سے ازل کی طرف بہہ رہا ہوں!

زمانوں کے سارے معطّر مکاتیب پر میرے "ہونے" کی مہریں لگی ہیں
مَیں ہر نامۂ معتبر کی جبیں پر کھُدا ہوں
دِلوں کے کڑے فاصلے، میری سچّی گواہی نہ ہو تو کبھی ختم ہوتے نہیں ہیں
مَیں تارِ نظر ہوں، مَیں یادوں کی برکھا ہوں
بہتے ہوئے چاند کی روشنی ہوں کہ جس میں سبھی
غُسل کرنے پہ مجبور ہیں
دوستوں دشمنوں میں مرے دم قدم ہی سے ترسیل کا سلسلہ ہے!

مَیں تارِ نظر ہوں
میں سیّال سا رابطہ ہوں
مقدّر میں میرے لکھا ہے کہ مَیں سانس بن کر
اِک اِک تن میں اُتروں، اِک اِک تن سے باہر کو آؤں
زمانوں کو تازہ لہو کی حرارت مہیّا کروں
ہست کو نیست ہونے سے ہر دم بچاؤں
مگر اپنی خاطر کوئی جسم ہرگز نہ مانگوں
کسی ایک منزل پہ رُکنے نہ پاؤں

عجب فیصلہ ہے!
عجب یہ سزا ہے!

ازل اور ابد کی مسافت میں جھونکے کی صورت میں اُڑتا پھروں
اپنی صُورت کو ترسا کروں
اپنی تجرید میں خوش رہوں
اور زندہ رہوں
اور زندہ رہوں!!

دیواریں!

صدیوں گُنگ رہیں دیواریں

اور پھر اِک شب جانے کیسے
دیواروں پر لفظوں کے انگارے چمکے
انگاروں نے مِل جُل کر شعلے بھڑکائے
سارے شہر میں آگ لگی
کاغذ کے ملبوس جلے
کالے ننگے جسموں سے بازار بھرے
آوازوں کے جھکڑ آئے — بادل چیخا
آنگن کے بے داغ بدن پر
جلی ہوئی ہڈیوں کے اولے
پتھر بن کر برس پڑے

اگلے دن جب اُجلی دھوپ پگھلنے آئی
سب نے دیکھا
دیواروں کے لب نیلے تھے
سب ننگی تھیں
گھٹتے بڑھتے سایوں کی گونگی بھاشا میں
بول رہی تھیں !!

دُھوپ

کہا میں نے — آ
اپنے برفاب گھر کے مقفل کواڑوں کو تو کھول کر
اُس سمندر کو تک
جو خنک تیرگی کی سیہ باڑ کو پار کر کے
تیرے گھر کی دہلیز تک آ گیا ہے !

یہ پیلی تمازت کا سیلِ رواں
میرے خستہ بدن سے تھکاوٹ کی میلی تہوں کو اتارے
مرے بند کانوں میں بھونروں کی بانی کا امرت گرائے
مجھے اپنے پھیلے ہوئے زرد دامن میں بھر لے
میں سونے لگوں تو مجھے گدگدائے
میں جاگوں تو میرے پپوٹوں پہ
کرنوں کی، خوابوں کی برکھا انڈیلے !

یہ پہلی تمازت کا سیلِ رواں اب
مجھے پار کر کے تیرے در پہ دستک اگر دے رہا ہے
تو اپنے مقفّل کواڑوں کو تُو کھول — باہر نکل
ہات اپنے ہلا کر اُسے اپنی جانب بُلا
اپنے خستہ بدن پر سے تُو اپنی میّت کا چھتّر ہٹا
گھاس کو اِذن دے وہ حسیں سبز قالین اپنا بچھائے
درختوں پہ گجرے نظر آئیں، طائر چہکنے لگیں
برف پگھلے
غصیلی، سرافراز، بے رحم، ٹھنڈی ہَوا اپنے گھر کو سدھارے
دُکھی فرش سے ماورا عرش تک
دُھوپ کا اک ہمکتا سمندر رہے موجزن
جس میں تُو — اور مَیں
سُرخ بجروں کی صورت، نہ ڈوبیں نہ اُبھریں
فقط دُھوپ کو اپنے چہروں پہ مَل کر کہیں
ہم اَمر ہو گئے ہیں!!

نبّاض

روگ
باہر کی طرف آئے
تو چہرے پہ لکیریں اس کی
یُوں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ اُبھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں!

میں نے نبّاض سے پوچھا کہ مرے روگ کی صُورت کیا ہے؛
(کیسا نبّاض ہے وہ ۔ بات تو کرتا ہی نہیں
اُس کے ہونٹوں پہ مہکتی ہوئی آیات مگر
اُس کے اندر کی کسی شے کا پتہ دیتی ہیں)
اُنگلیاں اُس نے مری نبض پہ رکھ دیں تو معاً
اُس کے ہونٹوں پہ مہکتی ہوئی آیات کا کہرام اُٹھا
اور چہرے کی لکیروں نے دہن کھول دیئے

اُس نے کاغذ پہ لکھا : روگ تمہارا یہ ہے !
میں نے کاغذ پہ لکھا : روگ تمہارا بھی تو میرے ہی سجل روگ کا آئینہ ہے!
اور پھر آئینے اِک دوسرے کو دیکھ کے حیران ہوئے
اپنے روگوں کے نگہبان ہوئے

روگ باہر کی طرف آئے تو چہرے پہ لکیریں اُس کی
یوں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ ابھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں
گرم شہروں کی اُدھڑتی ہوئی سڑکوں کی طرح
اور اُن کھیتوں کے مانند جو اپنے ہی پسینے میں شرابور —
مکانوں کی غلاظت میں دھنسے اُجلے مکینوں ایسے
نبض پر انگلیاں رکھے مَیں کھڑا ہوں کب سے
جانتا ہوں کہ اگر میں نے کسی پُرزے پہ کُچھ لکھا تو وہ
اُسی کاغذ پہ اُگل دے گا وہ سب کچھ
جو مرے دُکھتے ہوئے جسم کے ہر انگ میں ہے
میرے سینے کے نہاں خانۂ صد رنگ میں ہے!

روگ آواز نہیں ہے کہ اسے گہری لکیروں میں کوئی بند کرے
اور پھر نبض پہ انگلی رکھ کر
اِک گھِسے نغمے کی بیٹھی ہوئی سِسکار سُنے

روگ آئینے کی صورت ہے ۔ اسے کوئی اگر
رُو برُو لائے تو سو رنگ میں لَو دیتا ہے
ورنہ پتھر ہے کہ صدیوں سے پڑا ہے بےحس
زنگ اور دھول کی چادر میں چھپائے خود کو
اپنے اندر کی غلاظت سے سجائے خود کو !

عجیب ہے یہ سلسلہ!

عجیب ہے یہ سلسلہ
یہ سلسلہ عجیب ہے
ہَوا چلے — تو کھیتیوں میں دُھوم چہچہوں کی ہے
ہَوا رُکے — تو مُردنی ہے
مُردنی کی راکھ کا نزول ہے
کہاں ہے تُو — کہاں ہے تُو؛
کہاں نہیں ہے تُو — بتا!
ابھی تھا تیرے گرتے اڑتے آنچلوں کا سلسلہ
اور اب اُفق پہ دُور تک
گئے دنوں کی دھُول ہے
گئے دنوں کی دھُول کا یہ سلسلہ فضول ہے!

مَیں رو سکوں
تو کیا یہ گدلی کائنات دُھل سکے گی
میرے آنسوؤں کے جھاگ سے ؛
مَیں مُسکرا سکوں
تو کیا سفر کی خستگی کو بھول کر یہ کارواں نجوم کے
برس پڑیں گے موتیے کے پھُول بن کے
اس مہیب کاسۂ حیات میں ؛

نہ تُو سُنے ، نہ میں کہوں
نہ میرے انگ انگ سے صدا اُٹھے
یُوں ہی — میں آنسوؤں کو ، قہقہوں کو
اپنے دل میں دفن کر کے
گُم
لبوں پہ سِل دھرے
ترے نگر میں پا پیادہ ، پا برہنہ
شام کے فشار تک رواں رہوں
مگر کبھی
تری نظر کے آستاں کو
پار تک نہ کر سکوں

کہ تُو ازل سے تا ابد
ہزار، صد ہزار آنکھ والے وقت
کی نقیب ہے
یہ سلسلہ عجیب ہے
یہ سلسلہ عجیب ہے!!

ایک خواب

دُھندلکوں کے باریک دھاگوں میں لپٹی ہوئی
مطمئن، بے خبر
میں نے دیکھا — وہ مجھ پر جُھکی تھی
وہ چشمِ حسیں جس کے ہر انگ میں ماماتا تھی
مجھے یوں لگا تھا وہ چشمِ حسیں تو مجھے
بس مجھے گھُورتی ہے
کسی اور کو دیکھنے کی اُسے نہ تو فرصت
نہ ہمت، نہ خواہش
فقط مرکزِ ہست کو دیکھتی ہے
مجھے دیکھتی ہے!

مَیں اُس آنکھ کی جھیل میں تیرتے سبز بجرے
کی درزوں سے رِستے ہوئے گرم سیّال سونے کی بوندوں

کے پیچھے لپکتا رہا — جگنوؤں سے مجھے اُن دنوں کیسی رغبت تھی!
میں — جلتے بجھتے ہوئے پیکروں کو پکڑ کر
انہیں اپنے تن پر سجانے کی خواہش میں
کس درجہ بے بس ہوا تھا
کہ میں خود بھی شاید
چمکتے ہوئے جگنوؤں کے سمندر میں
اک جلتا بجھتا سا جگنو تھا
اپنے ہی ہم زاد کو ڈھونڈتا تھا!

زمانہ — وہ مکتب سے بھاگا ہوا وحشی لڑکا
جو میرے تعاقب میں گِر گِر کے پاگل ہوا تھا
اُسے دُھن اگر تھی تو بس اس قدر تھی
کہ وہ اپنی مٹھی میں مجھ کو گرفتار کر کے دکھائے
زمان و مکاں کی حدوں میں
کسی صاف تختی کے چہرے پہ لکھے
سیاہی کے بے نام نقطے پہ رُکنے کا خوگر بنائے

مگر میں تو اُس آنکھ کے آبِ گُم کا شناور
زمانے کی مٹھی میں آنے سے بیزار تھا

جانتا تھا کہ ظالم زمانہ تو وحشی پرندے کی صورت
گرسنہ نگاہوں کے عزفوں سے مجھ کو ہمیشہ تکے گا
میں اس بات سے آشنا تھا
کہ میں گر رُکا
تو مجھے آنکھ سے گرم آنسو کی صورت ٹپکنا پڑے گا
کسی سبز موتی کی ٹھنڈی لحد میں اُترنا پڑے گا

پھر اِک روز
وحشی پرندے کی پہلی جھپٹ مجھ پہ نازل ہوئی
آنکھ رونے لگی
اور میں زخم کو چاٹتا
جھیل کے پانیوں میں سِسکتا پھرا
آنکھ روتی رہی
ہر جھپٹ پر وہ آنسو کے قطروں میں ڈھل کر
کناروں سے باہر نکل کر بکھرتی رہی
اور پھر — ایک دِن
جھیل پانی کے امرت سے خالی ہوئی
جلنے بُجھنے کے عالم سے آزاد ہو کر
زمان و مکاں کی حدوں میں

کسی صاف تختی کے چہرے پہ دھتبہ بنی

اور میں

نیلے آکاش پر چھینٹے اور ہنستے ہوئے اُس پرندے
کی آنکھوں میں اپنی ہی تصویر کو دیکھ کر مسکرایا
سیاہی کے جادُو سے باہر نکل کر میں اپنے ہی عرفان سے جگمگایا
زمانہ مجھے دیکھ کر مجھ پہ جھپٹا
مگر میں تو اِک جھیل تھا، میرے اندر زمانوں کے بجرے تھے
بجروں سے سیّال سونے کی کرنیں نکلنے لگی تھیں
زمانہ مجھے اپنے پنجے میں لینے کو جھپٹا مگر ایک پل میں
وہ خود میری مُٹھی میں محبوس تھا
ایک جُگنو۔ جِسے میں نے ماتھے پہ قشقہ بنا کر لگایا
جِسے میں نے موتی کی ٹھنڈی لحد میں اُتارا
جِسے میں نے ٹھنڈی لحد کے کنارے کا کتبہ بنایا!!

نامَوجُود کے بھاری دَر پر

آنکھیں کور اور چہرہ شَل
ہونٹوں کے دروازے بند
پیشانی — مرمر کی سِل
سِل پر لکھی ایک عبارت :
یہ وہ عالی شان عمارت
شپرک جس کے باسی
بیلیں جس کی پیاسی!

مَیں بیلوں کے کُنبے کا اِکلوتا وارث
اپنے تن کی کہنہ عمارت سے چِمٹا ہوں
لانبے، پتلے، سانپوں ایسے ہاتھوں سے مَیں
دیواروں پر رینگ رہا ہوں

دروازوں سے لپٹ رہا ہوں
تاریکی کے بے آواز سمندر کو چھُوتا ہوں
نامعلوم کے پردوں تک بڑھ جاتا ہوں
پھر کچھ آگے
ناموجود کے بھاری دَر سے ٹکراتا ہوں

میں ہیاؤں کے کُنبے کا اِکلوتا وارث
آنکھوں سے محروم سراسر
لانبے، پتلے، سانپوں ایسے ہاتھوں سے میں
بھاری بھرکم دروازے پر
دستک دیتے دیتے ہار گیا ہُوں
کب اپنی دہلیز سے لیکن پار گیا ہُوں؟

ذات کے روگ میں

تب وہ بے ساختہ رو پڑے، سینہ کوبی کرے
جانے والے کا ماتم کرے
بین کرتی پھرے
آخری پات کے سوگ میں
تلملاتی رہے
ذات کے روگ میں!

پھر وہ رُت آئے جب
چکنی، کائی زدہ سی چٹانوں پہ دیکھوں میں خود کو
مَیں آنکھوں کے پانی کو روکوں مگر پانی کیسے رُکے
تب میں چیخوں، بُلاؤں اُسے
گہرے نیلے سمندر کی تہہ میں وہ ہوگی کہیں، کون جانے!
مگر وہ بلاوے کو سُن کر، سمندر کی تہہ سے اُبھر کر
مرے پاس آئے، مجھے چھُو کے دیکھے

کہے، تُم کہاں تھے؛
خُدارا بتاؤ کہ تم اتنا عرصہ کہاں تھے؛
مُجھے خود سے لپٹائے، مہکی ہوئی گود میں لے کے جھُولا جھُلائے
کوئی گیت گائے جو سیّال چاندی کا چشمہ سا بن کر بہے
دُھند بن کر اُڑے،
مُجھ کو سُورج کی چُبھتی تمازت سے محفوظ کر دے
کہے: اب تو جانے نہ دوں گی تمہیں
اب میں جانے نہ دوں گی تمہیں!

اور مَیں
اپنے بوجھل پپوٹوں کو میچے
کسی نرم جھونکے کے قدموں کی آہٹ سُنوں
تنگ ہوتے ہوئے دُودھیا بازوؤں کے
ملائم سے حلقے میں سونے لگوں
کاش سونے لگوں
کاش میں سو سکوں!

ہَوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے!

سُلگتی شب کا عجب سماں تھا
فلک تھا پیتل کا تھال جس میں
چمکتا، کانسی کا چندرماں تھا
دیئے کے مانند ضَوفشاں تھا
درخت چُپ تھے کہ جس طرح پابجولاں مُجرم
مکاں کی چھت کا اِک ایک شہتیر
زمیں کے مرقد کا پاسباں تھا
تھا تنگ گلیوں میں گرم اینٹوں کا فرش جس پر
رُکا ہُوا بے لباس جسموں کا کارواں تھا
میں اس قدر تھک چُکا ہوں — مجھ کو
کبھی نہ اس بات کا گُماں تھا
سُلگ رہی تھی زمین ساری
تمام عالم دھواں دھواں تھا!

سحر سے پہلے

نجانے کیسے کسی نے قفلِ جمود توڑا
ہَوا کے جھونکے کو بند پنجرے سے دی رہائی
فضائیں چھوڑا
ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے
بدن کو تولا
چہک اُٹھے شاخ شاخ پتے
چمکتا، کانسی کا چاند ۔ بولا!
پَروں کا اُجلا سا لمس
میرے بدن پر اُترا تو میں بھی زندوں کی
صف میں آیا
مگر وہ جھونکا تو اک پرندہ تھا
اُڑ گیا شب کے راستوں پر
کبھی نہ پھر لوٹ کر وہ آیا!

اگر مری ذات ایک زنداں ہے
جس کے دَر سے نکل کے تُم پھر
کھُلی فضاؤں میں پَر فشاں ہو
تو مجُھ کو تُم سے گِلہ نہیں ہے
ہَوا کے جھونکے سے کب کسی نے گلِہ کیا ہے؟

واپسی

گلی بھی وہی ہے
مکاں بھی وہی ہے
وہی ہے مکاں کا پُراسرار بے نُور زینہ
مگر چور قدموں کی بے نام آہٹ
ملائم لبادے کی محجوب سی سرسراہٹ
"ہٹو، راستہ چھوڑ دو" کی چمکتی غصیلی ادا
پھر ہنسی ضبط کرنے کی مدھم صدا
وہ صدا اب نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے
کہیں کچھ نہیں ہے
خموشی کی بھیگی ہوئی التجا کے سوا

یہ سنسان زینہ کہ صحرا کی صورت ہے پھیلا ہُوا
اس کی ٹھہری ہوئی، ریت ہوتی ہوئی سلوٹوں میں کہیں

رُت کے پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں اب بھی ہوں گی
لرزتے ہوئے مکڑیوں کے پُراسرار جالوں میں
سرگوشیاں
چھُو لیتے نرم دھاگوں میں لپٹی ہوئی
اَن کہی داستاں کی طرح بے زباں اب بھی ہوں گی
گِھسی اور اُکھڑی ہوئی چھوٹی اینٹوں پہ
مہندی کی سُرخی کا مدھم سا کوئی نشاں اب بھی ہوگا
مگر — تازہ پھولوں کی پاگل مہک
اور مہکتے لبادے میں اُجلا بدن
اور کھنکتی ہنسی
پھر ہنسی ضبط کرنے کی مدھم صدا
تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں کا مُدھر سلسلہ
وہ مُدھر سلسلہ اب کہاں ہے!
زمانے کے جالے میں محبوس، اُلجھی ہوئی یہ صدا
جس کی خاطر تُو سنسان زینے کے پہلے قدم پر کھڑا ہے
صدا تو نہیں ہے
فقط لاش ہے ایک مُردہ صدا کی !!

اگر ازل سے یہی چلن ہے!

سفید لفظوں کے بادبانی جہاز آئیں
خزاں زدہ خشک ساحلوں سے بدن ملائیں
اُچھال دیں اپنے سب خزانے — ہزاروں لاکھوں سفید چوہے
جو چوڑ قدموں، طویل مونچھوں، شریر پنجوں کو آزمائیں
مہیب، کالے، حریص جنگل میں جا بجا راستے بنائیں!

حریص جنگل سے کالے شبدوں کا رقص کرتا ہجوم نکلے
سفید مرمر کے ساحلوں پر عبارتوں کے دیئے جلائے
بڑی ہی نفرت سے سنگِ لرزاں پہ چھوڑ جائے
سقیم ورثہ — جو آنے والی مریض نسلوں کے کام آئے!

سیاہ بادل کے میان میں گر
سفید بجلی چمکتی تلوار بن گئی ہے

اگر تمہاری سیاہ آنکھوں کی گودیوں میں
سنہرے خوابوں کی کشتیاں ہیں
فلک کی کالی زمیں پہ ہر شب
کِھلا ہوا موتیے کے پھولوں کا اِک چمن ہے
اگر ازل سے یہی چلن ہے
تو پھر یہ نمناک ساحلوں کے سفید مرمر پہ
کالے شبدوں کا رقص کرتا ہجوم کیا ہے ؛
مہیب، کالے، حریص جنگل میں چور قدموں کی چاپ کیا ہے ؛
سقیم ورثے کا راز کیا ہے ؛

ہَوا کہتی رہی آؤ ـــــ

ہَوا کہتی رہی آؤ
چلو اُس شاخ کو چھُو لیں
اُدھر، اُس پیڑ کے پتّوں میں چھُپ کر تالیاں پیٹیں
گریں، اُٹھیں، لُڑھک کر نہر میں اُتریں، نہائیں
مخملیں سبزے پہ ننگے پاؤں چل کر دُور تک جائیں!

ہَوا کہتی رہی آؤ
مگر میں خشک چھاگل اپنے دانتوں میں دبائے
پیاس کی برہم سپہ سے لڑ رہا تھا، میں کہاں جاتا
مجھے سُورج کے رتھ سے آتشیں تیروں کا آنا
اور چھاگل سے ٹپک کر آب کا گرنا
کسی بچّے کا رونا اور پانی مانگنا بھُولا نہیں تھا، میں کہاں جاتا
مَیں اپنے ہاتھ کی اُبھری رگوں میں قید
اپنی آنکھ کی تپتی ہوئی خاکِ سیہ میں جذب تھا یکسر

مُجھے اِک جُرعۂ آبِ صَفا درکار تھا۔ اور میرے بچّے نے
صدا دی تھی مجھے: آؤ، خدا را اب تو آجاؤ
کہ میرے ہونٹ اب پھٹ بھی چُکے
آنکھوں کا امرت سُوکھ کر بادل بنا، اُڑ بھی گیا!

ہوا کہتی رہی آؤ
یہ بندھن توڑ دو پیارے
مگر میں ہاتھ کی اُبھری رگوں میں قید
اپنی آنکھ کی تپتی ہوئی خاکِ سیہ میں جذب ـ کیا کرتا!
کہاں جاتا!!

نشرگاہ

فقط اپنے ہونے کا اعلان مَیں نے کیا
یہ نہ سوچا
کہاں سے چلا تھا، کہاں آکے ٹھہرا
مَیں کس منزلِ بے نشاں کی طرف اب رواں ہُوں؟
مجھے خُشک، بدرنگ چمڑے پہ لکھے سوالوں سے رغبت نہیں تھی
مَیں منطق کی ورزش سے خود کو تھکانا نہیں چاہتا تھا

فقط اپنے ہونے کا اعلان مَیں نے کیا
اور دیکھا
فلک کی سیہ، گہری، سُوکھی ہوئی باولی سے
کروڑوں ستارے
شعاعوں کی بے سمت، بے لفظ، گونگی زباں میں
لرزتے لبوں سے
"نہ ہونے" کے مُنکر تھے

ہونے کا اعلان کرتے چلے جا رہے تھے!

فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
اور بیتاب پھولوں سے، ساون کے جھولوں سے
چڑیوں کی لوری سے
ہر زندہ ہستی کے سانسوں کی ڈوری سے
آواز آئی:
مجھے اپنے "ہونے" کا حق الیقیں ہے
مَیں اعلان کرتی ہوں اپنا!

عجب سلسلہ تھا
کروڑوں برس کی مسافت پہ پھیلا ہوا سارا عالم
صداؤں کی، لہروں کی اک چیختی نشترگہہ بن چکا تھا
فقط اپنے ہونے کا اعلان کرتا چلا جا رہا تھا

یہ اعلان کس کے لئے تھا؟
تخاطب کا رُخ کون سی سمت میں تھا؟؟
تجھے کیا خبر ہے!
تُو اس نشترگہہ کا فقط ایک ادنیٰ ملازم
تُو کچھ بھی [illegible] ہے!!

سمندر اگر میرے اندر آ گرے!

سمندر اگر میرے اندر گرے
تو پایاب لہروں میں ڈھل کر سلگنے لگے
پیاس کے بے نشاں دشت میں
وہیل مچھلی کی صورت تڑپنے لگے
ہارپونوں سے، نیزوں سے چھلنی بدن پر
دہکتی ہوئی ریت کے تیز جرکے سہے
اور پھر ریت پر جھاگ کے کچھ نشاں چھوڑ کر
تا ابد سر بریدہ سے ساحل کے سناٹے میں
"ہونے نہ ہونے" کی میٹھی اذیت میں کھویا رہے!

یہ ہونے نہ ہونے کی میٹھی اذیت بھی کیا ہے!
نگاہیں اٹھاؤں تو حدِ نظر تک
ازل اور ابد کے ستونوں پہ باریک سا ایک خیمہ تنا ہے

("نہ ہونے" کا یہ رُوپ کتنا نیا ہے)
اور خیمے کے اندر
کروڑوں ستاروں کا میلہ لگا ہے
("یہ ہونے" کا بہروپ لا انتہا ہے)

مرا جسم
ریشم کا صد چاک خیمہ
کسی بے کراں دشت میں بے سہارا کھڑا ہے
مگر جب میں آنکھیں جُھکاؤں
تو اس سرد خیمے کے اندر
کروڑوں تڑپتے ہوئے تند ذرّوں کا اِک دشت پھیلا ہُوا ہے

یہ ہونے نہ ہونے کی میٹھی اذیت
عجب ماجرا ہے!!

اشومیدھ یگیہ!

گوری چِتّی یال ــ گھنی سی
دُودھ ایسی پوشاک بدن کی
لانبے نازک ماتھے پر مہندی کا گھاؤ
اُڑتی، گرتی خاک سُموں کی
مُٹھی بھر کر، مُنہ پر مَل کر، دل کی پیاس بُجھاؤ
صدیوں کے دُکھ جھیلتے جاؤ

رہے سفر میں
ہرے مہکتے کھیتوں میں خوش باش پھرے
اپنے پیچھے آتی قوت کے نشے میں کھویا
رستے کے ہر بھاری پتھر کو ٹھوکر سے توڑے
آگے ہی آگے کو دوڑے

آج یہاں تک آ پہنچا ہے
پر وہ کل اب دُور نہیں ہے
جب اس کے قدموں کے بہالے
قریہ، قصبہ، شہر، سبھی کو
پل بھر میں مسمار کریں گے
ہر شے کو تاراج کریں گے
اِس مرقد سے
اُس مرقد تک
راج کریں گے!

اور پھر وہ دن بھی آئے گا
جب اِک تیز سنہرا نشتر
شہ رگ میں اس کی، اترے گا
خوُن کا فوارہ چھُوٹے گا
اور وہ قوت
رینگتی اور پھنکارتی قوت
موج میں آ کر ناچ اُٹھے گی
خوشی سے پاگل ہو جائے گی!!

اِک تنہا، بے برگ شجر!

کون مجھے دُکھ دے سکتا ہے!
دُکھ تو میرے اندر کی کِشت ویراں کا
اِک تنہا، بے برگ شجر ہے
رُت کی نازک لانبی پوریں
— کرنیں، خوشبو، چاپ، ہوائیں
جسموں پر جب رینگنے پھرنے لگتی ہیں
میرے اندر دُکھ کا سویا پیڑ بھی جاگ اُٹھتا ہے!
تنگ مساموں کے عزفوں سے
لمبی، نازک شاخیں پھن پھیلا کر
تن کی اندھی شریانوں میں قدم قدم چلنے لگتی ہیں
شریانوں سے رگوں، رگوں سے نسوں کے اندر تک
جانے لگتی ہیں
پھر وہ گرم لہو میں رل کر

اِک اِک بال کی جڑ تک پھیلتی جاتی ہیں
اور یہ میرا صدیوں پُرانا مسکن، خاکی مسکن
خود بھی ایک شجر بن جاتا ہے
وقت کی قطرہ قطرہ ٹپکتی
سُرخ زباں کی نوک پہ آکر
جَم جاتا ہے!!

دست بستہ کھڑا ہوں!

ہَوا — ایک نابینا لڑکی ہے
آنکھوں کے جنگل میں ہاتھوں سے رستہ بناتے ہوئے چل رہی ہے
کوئی اس کے کشکول میں کوئی سکّہ گرائے
جَلی خُشک روٹی کا ٹکڑا اُسے دان دے تو — ہَوا
اپنے محسن کو میٹھی سی کومل دُعا دے کے آگے کو بڑھتی ہے
گہرے دُھندلکوں میں لپٹی ہوئی منزلِ بے نشاں کی طرف
آسماں کی طرف

اَزل سے مَیں اس اندھی لڑکی کے پیچھے
زمیں پر گرے بھیک کے خشک ٹکڑوں پہ پلتا رہا ہوں
کِسی منزلِ بے نشاں کی طرف سُست قدموں سے چلتا رہا ہوں
مگر اب مجھے اس سفر سے
چمکتی ہوئی سُرخ راکھی کے بندھن سے

اندھی ہوا کے چلن سے
کسی سے بھی رغبت نہیں ہے!

چلو
(خود سے کہتا ہوں)
اس اندھی لڑکی کا اب ساتھ چھوڑیں
شب و روز کے دائرے سے نکل کر
ذرا اپنی جانب بھی رُخ اپنا موڑیں!

میں اپنی طرف مڑ گیا ہوں
مگر دیکھتا ہوں
مَیں خود اپنے رستے میں اک سبز جنگل کی صورت کھڑا ہوں
ہزاروں تنوں، اَنگنت شاخساروں، کروڑوں گھنی جھاڑیوں سے اَٹا ہوں
مَیں اُن ساری پگڈنڈیوں کو
جو میری طرف بے تحاشا اُمنڈنے لگی تھیں
خنک بے نیازی سے ٹھکرا رہا ہوں!

مَیں اب تیرہ جنگل کی ٹیڑھی سیہ انگلیوں
سانپ ایسی مڑی ٹہنیوں میں اُترنے لگا ہوں
اندھیرے کی دُنیا میں مشعل کی صورت بڑھا ہوں

تراشیدہ رستے تو جنگل کے باہر کہیں رہ گئے ہیں
گھنے، تیرہ، جنگل کے اندر میں خود اپنا رستہ بنا ہوں!

عجب روشنی ہے
اندھیرے کے کشکول میں کس نے سونے کا دینار پھینکا
کہ کلیاں شعاعوں کی کھِلنے لگیں
سارے جنگل کے پتّے زمرّد بنے، ٹہنیاں پیلے سونے کی چھڑیاں ہوئیں
جھاڑیوں میں دہکنے لگے سُرخ پھُولوں کے فانوس
سات رنگوں کی پریاں انوکھا سا اِک رقص کرنے لگیں
اور پھر میں نے دیکھا
کہ میں اپنے ہی رُو برُو دست بستہ کھڑا ہوں
میں تاریک جنگل خود اپنے ہی پَرتو سے اندھا ہوا ہوں!

آویزش

آج پھر اُس سے ملاقات ہوئی
باغ کے مغربی گوشے میں جُھکے نیم کے چھتنار تلے
ایک بدرنگ سی چادر پہ وہ بیٹھا تھا مجھے دیکھ کے سرشار ہُوا:
"بھائی کیسے ہو! نظر تم کبھی آتے ہی نہیں
آؤ کُچھ دیر مرے پاس تو بیٹھو، دیکھو!
کیسا چُپ چاپ ہے یہ باغ کا گوشہ جیسے
کِسی موّاج سمندر میں جزیرہ کوئی
دُور وہ سُرمئی بادل کی فروزاں جھالر
جیسے، ہاں جیسے — مگر خیر کوئی بات نہیں
آؤ، تُم پاس تو بیٹھو میرے!

اَور میں بیٹھ گیا
اُس کے ہونٹوں سے اُترتے ہوئے الفاظ کی چہکار میں تادیر میں خاموش رہا
کیسی چہکار تھی وہ — خُشک پیڑوں میں ہوا کا نوحہ

جیسے گرتے ہوئے پتّوں کی لگاتار صدا!

دفعتاً سوچ کے اک اجنبی جھونکے نے مجھے چھیڑ دیا:
جانے کب سے یہ مسافر ہے جزیرے میں مقیّد تنہا
منتظر، آئے گی اک روز کہیں سے ناؤ
بادباں ابر کا، چاندی کے چمکتے چپو
رسمساتی ہوئی اِک نرم رسیلی آواز:
تُو کہاں ہے؟ تو کہاں ہے کہ تجھے
ڈھونڈتے ڈھونڈتے، میں ہار گئی ہار گئی!!

اور بدرنگ سی چادر پہ وہ بیٹھا ہوا شخص
خواب میں بولتا جاتا تھا، سیہ باسی لفظ
اُس کے سُوکھے ہوئے ہونٹوں سے نکل کر ہر سُو
جُھوٹے سکّوں کا بناتے چلے جاتے تھے حصار!

آج پھر اُس سے ملاقات ہوئی
وہیں، اُس باغ کے گوشے میں، جُھکے نیم کے چھتنار تلے
آج پھر اُس سے ملاقات ہوئی!!

جب آنکھ کھُلی میری

سُورج کا زِرہ بکتر
چمکا — تو میں گھبرایا
ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے
لہراتا ہُوا نیزہ
کوندے کی طرح آیا
میں درد سے چلّایا

ہونٹوں نے پڑھے منتر
سیماب سی پوروں نے
اِک پوٹلی ابرک کی
چھڑکی میرے چہرے پر
اور کرنوں کا اک چھینٹا

مارا میری آنکھوں پر
آنکھیں میری چُندھیائیں
کچُھ بھی نہ نظر آیا

جب آنکھ کھُلی میری
دیکھا کہ ہر اِک جانب
زر تار سی کرِنوں کا
اِک زرد سمندر تھا
اور زرد سمندر میں
چاندی کی پہاڑی پہ
مَیں پیڑ تھا سونے کا
شاخوں میں مری ہر سُو
جھنکار تھی پتّوں کی
اُڑتی ہوئی چڑیوں کی
یا آگ کی ڈلیوں کی
اِک ڈار سی آئی تھی
اَور مجُھ میں سمائی تھی
قدموں کے تلے میرے
زنجیر تھی لمحوں کی،

میرے زرہ بکتر سے
جو کوندا لپکتا تھا
تاروں کے جھروکوں تک
پل بھر میں پہنچتا تھا
مَیں جسم کے مرقد سے
باہر بھی تھا، اندر بھی
میں خود ہی پہاڑی تھا
اور خود ہی سمندر بھی!

وہ اِک تازہ شئے!

وہ اِک تازہ شئے جو درختوں میں ہے
اور پرندوں میں ہے
بانس کے گنگناتے ہوئے جنگلوں
اوس کھائی ہوئی گھاس کی سلوٹوں
ہل چلے کھیت کی گرم سانسوں میں ہے
نرم بھادوں میں ہے
پوست کی کیاریوں میں، لجاتی ہوئی دلہنوں
کے معطّر لبادوں میں ہے!

وہ اِک تازہ شئے
جو گھنے شہر کے ہر محلّے
کے اونچے مکاں کی سیہ رنگ مٹی پہ
سورج کی پہلی کرن بن کے آتی ہے

گندی منڈیروں پہ ٹھوڑی ٹکائے
گلی کے سیہ فرش کو گھورتی ہے
مگر تنگ زینے سے نیچے اُترتی نہیں ہے

وہ اک تازہ شے
جو تری آنکھ کے نیم وا سے دریچے میں
مٹّی کا صدیوں پرانا دیا بن کے جلتی رہی ہے
مگر اب نہیں ہے!!

سلومی

بانکی، بھینی، نازک خوشبو
شعلہ بن کر اُتری
شبنم بن کر بکھری
نُورانی پیکر میں ڈھلی اور گھوم گئی
نشہ بن کر جھوم گئی
آنکھ لجا کر، جسم چُرا کر
رقص کیا
گات دکھا کر، ہاتھ گھما کر چھب دکھلا کر
رقص کیا
اپنی ہی جھنکار میں یکسر ڈوب گئی!

بین بجی
تو کالی، رینگتی سازش بن کر

اپنے ہی گھنگھرو کے بھاری پردے سے
باہر کو لپکی
خنجر بن کر چمکی
گردن کی شہ رگ میں اُتری
چلّو بھر کر خون پیا
اپنی ہی جھنکار میں یکسر ڈوب گئی !

بوجھل سی اک سرگوشی نے پنکھ پسیٹے
ٹوٹے پھوٹے لفظ سمیٹے :
"تم بھی ؟ — لو اب تم بھی ؟"
حیرت — آنکھوں کے مرمر پر جیسے نقش ہوئی ہے
طشت میں اپنا سر رکھے وہ ناچ رہی ہے !

ٹین کا ڈبہ

سمندر کے بوسوں سے ہاری ہوئی ریت —
ریت پر ٹوٹی پھوٹی، پرانی، سیہ زنگ چیزوں کے انبار میں
ایک پچکا ہوا ٹین کا زرد ڈبہ
سیاہی کے برہم سمندر نے جس کو اُچھالا
سیاہی کے بے نام ساحل نے جس کو سنبھالا
اندھیرے میں بکھرے ہوئے مُردہ لمحوں کے اِک ڈھیر میں
پاشکستہ سی اک ساعتِ نیم جاں
کالے قرنوں کے سفرِ مسلسل کی اِک داستاں!

کالے قرنوں کی وہ داستاں
تیرگی کی چٹانوں سے ٹکرائی
ٹکرا کے روشن ہوئی
گھُپ اندھیرے میں اُبھریں — لکیریں!
لکیروں سے بنتی گئیں صُورتیں

پیڑ، بادل، مکاں، ایک روشن ندی
اور روشن ندی کے کنارے، چمکتی ہوئی گھاس پر
دُودھیا اُون کی دھجیاں
روشنی کا ابھرتا ہوا اک جہاں!

تیرگی اب کہاں ہے؛
تڑپتی ہوئی ریت پر ہر طرف
شوخ کرنوں کا اک جال سا تن گیا ہے
چمکتا ہوا ٹین کا زرد ڈبہ
شعاعوں کا لاوا اُگلنے لگا ہے
اُبلتے ہوئے روشنی کے سمندر میں ڈھل کر
زمیں سے فلک تک اُچھلنے لگا ہے!!

ہَوا اگر میرا رُوپ دھارے!

ہَوا کچوکے لگا کے کہتی ہے: تُم ابھی سانس لے رہے ہو؟
ہَوا سے کیسے کہوں کہ میری یہ سانس تو ایک واہمہ ہے
ہزاروں کالی نحیف جونکیں
مرے بدن سے چمٹ گئی ہیں
بدن کے ساغر کو پی رہی ہیں
مَیں خشک ہوتے ہوئے شجر کا سفید پتّہ
ہَوا سے کیسے کہوں کہ میری یہ تھرتھراہٹ
خود اُس کے ہاتھوں کی کپکپی ہے
مری شکستہ اُڑان
اُس کی دہکتی پھونکوں کی قوس تک ہے
میں اِک لرزتا سا واہمہ ہوں
مہیب کھڈ کے لبوں پہ اٹکا ہَوائیں چکنا سا گول پتھر
ہَوا کی ٹھوکر کے خوف میں مُبتلا کھڑا ہوں!

ہَوا سے کیسے کہوں کہ میں اِک جری سپاہی
مَیں اپنے خنجر کی نوک سے خود ہی کٹ گیا ہوں
لہُو کے قطروں میں بٹ گیا ہوں

ہَوا اگر خوشبوؤں کا فرغل پہن کے آئے
ہَوا اگر بادلوں سے جھانکے
ہَوا کہے گر کہ وہ تو اِک لمس ہے ذرا سا
ہَوا اگر میرا رُوپ دھارے
مُجھے پُکارے
تو ہنس پڑوں میں
ہَوا کے قدموں کی دھُول بن کر
برس پڑوں مَیں

سفر کا دوسرا مرحلہ

چلی کب ہَوا، کب مٹا نقشِ پا
کب گری ریت کی وہ رِدا
جس میں چھُپتے ہوئے تُو نے مجھ سے کہا:
آگے بڑھ، آگے بڑھتا ہی جا
مُڑ کے تکنے کا اب فائدہ؟
کوئی چہرہ، کوئی چاپ، ماضی کی کوئی صدا — کچھ نہیں اب
اسے گلتے کے تنہا محافظ! ترا اب محافظ خُدا!

میرے ہونٹوں پہ کف
میرے رعشہ زدہ بازوؤں سے لٹکتی ہوئی گوشت کی دھجیاں
اور لاکھوں برس کا بڑھاپا

جو مجھ میں سما کر ہمکنے لگا

مجھ کو ماضی سے کٹنے کا کچھ ڈر نہیں
اپنے ہم زاد کو رُو برو پا کے میں غم زدہ بھی نہیں
یہ عصا، جھکتے شانوں پہ کالی عبا اور رگڑتے سے چلنے کی پیہم صدا،
اب یہی میری قسمت، یہی آسرا!!

کہانی

عجب دن تھے وہ
جھاڑیاں، آک کے جھنڈ، کائی زدہ تال
جن کے کنارے ہزاروں برس سے کھڑے
جنڈ اور ون کے ڈھانچے
پھلاہی کے پھر واں کے جنگل جو دھرتی پہ بچھ سے گئے تھے
اُداسی ہوا بن کے پھرتی تھی
اور سنت سادھو
پُرانے درختوں کے نیچے بچھی گھاس پر
آلتی پالتی مار کر بیٹھتے تھے
خود اپنے ہی اندر کے تاریک جنگل کا حصہ بنے تھے

عجب دن تھے وہ
جب بھی کچھ کہنا چاہا
گھِسے، مُردہ لفظوں کی کوئی گمک تک نہ آئی

جو آئی تو پھر ہونٹ ہل سے گئے
اور آنکھیں
نہ کہہ سکنے کے کرب میں مُبتلا ہو کے
اپنے ہی حلقوں سے باہر نکل آئیں، رِسنے لگیں
اور پھر ایک دِن
اونچے نیچے پہاڑوں سے ہوتا ہُوا وہ
یہاں آ کے ٹھہرا
یہاں آ کے اُس نے
معمر تریں وَن کے نیچے وہ شعلہ جگایا
کہ جس میں بھسم ہو گئے سب — یہ وَن، جنتر، پھر واں، پھلائی
ہُوا ہو گئے سنت سادھو، کٹی جھاڑیاں
اور کائی زدہ تال — دھرتی کے ناسُور
اب ان کا نام و نشاں بھی نہیں تھا
تب اُس نے
مقدّس عصا سے وہ جادُو جگایا کہ ساری فضا سَیلِ انوار میں بہہ گئی
گھونسلوں اور پھولوں میں ڈھلتی گئی یہ زمیں
چہچہوں، خوشبوؤں سے ہَرا اَٹ گئی!!

آج وہ لوٹ کر جا چُکا ہے

تو پھر کالی دھرتی کے اندر سے اُگ آئے ہیں
جنڈ کے پیڑ، کانٹوں بھری جھاڑیاں
پھر سے رسنے لگے ہیں
وہ کائی زدہ تال
جن کے اندر سے
منحوس سادھو نکل کر کناروں پہ بیٹھے ہوئے ہیں
اُداسی ہوا بن کے پھرنے لگی ہے
کسی نے الاؤ پہ بھاری قدم کیا رکھا ہے
اندھیرے کا بوجھل سا پٹ کُھل گیا ہے
فضا بُجھ گئی ہے!

فضا بُجھ گئی ہے
مگر کور آنکھوں کو کیسے دکھاؤں
کہ اُس بھاری پاؤں کے نیچے
اندھیرے کے بوجھل سے اُس پٹ کے پیچھے
کرن، اپنے بستر پہ لیٹی ہوئی ہے
سنہری سے اِک بیج میں سو رہی ہے!

بھوری مٹی کی تہہ کو ہٹائیں

چلو ہم بھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلائیں
زمیں پر اُترتی ہوئی برف کے سرد بوسوں سے خود کو بچائیں
نگاہوں میں وحشت، زباں پر کڑکتے ہوئے بول لائیں
گھنے دم بدم جلتے بجھتے ہوئے بادلوں سے گزر کر
ستاروں کے جھرمٹ کو ہاتھوں کی پوروں سے دو نیم کر کے بڑھیں
برف کے اک تڑخنے پگھلتے جہنم میں اُتریں
سیاہی کے یخ بستہ مرقد پہ آنسو بہائیں!

چٹانیں اگر کہنہ صدیوں کی گاڑھی، گھنی، گیلی بدبو میں
لتھڑی پڑی ہیں تو کیا ہے!
اگر گھاس کی لاش کو برف کی ایک میلی رضائی نے
آنگن کو مُردہ درختوں کی بھوبل نے ڈھانپا ہوا ہے تو کیا ہے!
کہ ہم راکھ کے ڈھیر
گرتی ہوئی برف کے بلبلے زرم گالے

کسیلی سی بدبُو کے بھبکے نہیں ہیں
تجھے کیا خبر ہم
زمیں کی طرح بھُوری مٹی کی اِک کھال اوڑھے ہوئے ہیں
اگر ہاتھ ہم کو میسر نہیں ہیں تو کیا ہے!
چلو اپنی پلکوں کے نیزوں سے اس بھُوری مٹّی کی تہہ کو ہٹائیں
چلو تیز شعلوں کے دوزخ میں اُتریں
اُبلتے ہوئے تُند لاوے کی موجوں میں دھُونی رَمائیں!!

اُس کے دُشمن!

سحر ہوئی تو کسی نے اُٹھ کر
لہو میں تر ایک سُرخ بوٹی
بڑی کراہت سے
آسماں کے فراخ آنگن میں پھینک دی اور
طویل متلی کی جان لیوا سی کیفیت سے نجات پائی!

مگر فلک کے فراخ آنگن میں
بادلوں کے سفید سگ اُس کے منتظر تھے
جھپٹ پڑے اُس لہو میں تر دِل کے لوتھڑے پر
جھپٹ پڑے ایک دوسرے پر
زمیں کے لوگوں نے دیر تک یہ لڑائی دیکھی
سفید کُتوں کے سُرخ جبڑے
لہو میں تر ایک لال ٹکڑا — دریدہ سُورج
حریص، غرّاتے بادلوں کا طویل، گہرا، مہیب دُکھڑا!!

مری زمیں بھی تو گرشت کا لوتھڑا تھی جس کو
کسی نے اندھے خلا میں پھینکا
مگر نہ کوئی بھی اس پہ جھپٹا
تب اس کے اندر سے آئے باہر
اُسی کے دُشمن
اُسی کی بُو پر
ہزاروں خونخوار، تُند کُتّے
حریص جبڑے
اور اب دریدہ زمین ساری
ٹپکتے گرتے لہو کے قطروں میں رِس رہی ہے
خود اپنے خونخوار تُند بچّوں کے تیز جبڑوں میں پِس رہی ہے !!

آمد

کبھی خشک موسم میں پُروا جو چلتی
تو بنجر پہاڑوں، گھنے گرد آلود شہروں سے کترا کے
ہم تک پہنچتی
ہمیں تُند یادوں کے گرداب میں
ڈوبتے اور اُبھرتے ہوئے دیکھ کر ہم سے کہتی:
میں اُن سب کے جسموں سے مَس ہو کے آئی ہوں
اُن کے پسینے کی خوشبو کو
اپنے لبادے میں بھر کر
ہتھیلی پہ رکھ کر میں لائی ہُوں!

کبھی سُرخ سُورج نکلتا
تو ہم اُس سے کہتے:

تمہاری دہکتی ہوئی آنکھ کا راز کیا ہے؟

وہ کہتا:

میں اُن سب کی آنکھوں کے غُرفوں سے

یہ ساری اُجلی تمازت چُراتا رہا ہوں

میں دریوزہ گر اُن چراغوں سے خود کو جلاتا رہا ہوں!

اُنہیں ہم نے ڈھونڈا

کبھی سبز شبنم کے چھینٹوں میں، تاروں کی روتی ہوئی انجمن میں

کبھی صُبح کی قتل گاہ، شب کے گھائل بدن میں

اُنہیں ہم نے آواز دی کُو بکُو

غم میں ڈوبی ہوئی بستیوں سے اُٹھے خاکدانِ وطن میں

مگر وہ نہیں تھے، کہیں بھی نہیں تھے

کہیں اُن کے قدموں کی ہلکی سی آواز تک بھی نہیں تھی!

پھر اک روز دھرتی کا موسم جو بدلا

تو بادل نے شانوں سے ہم کو ہلاکر جگایا

کہا: اُن کے آنے کا پیغام آیا

چہکتے پرندوں نے شاخوں سے اُڑ کر

ہواؤں میں اِک دائرہ سا بنایا

کہا: اُن کے آنے کا پیغام آیا
دھنک ۔ سات رنگوں میں لپٹی ہوئی
اِک کماں بن کے ظاہر ہوئی
ہم سے کہنے لگی ، اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں نے انہیں
تیز قدموں سے آتے ہوئے !
شام ہنسنے لگی
اُس کی آنکھوں میں خوشیوں کے آنسو تھے
عارض پہ شبنم
نگینوں کی صُورت چمکنے لگی تھی !!

اِک سیّال سونے کا — ساگر!

کس نے دیکھا
اِک سیّال سونے کا — ساگر
پتھر دِل ساحل سے اپنا پنڈ چھڑاتا
مچل مچل کر گرتا اُٹھتا اور غُرّاتا

کس نے دیکھا
اِک سیّال سونے کا — ساگر
تن کی بوڑھی دیواروں سے باہر آتا
بُجھے ہوئے تاریک بدن کو
کُندن رُوپ کی شوبھا دے کر
پلکوں کی نوکوں پر رُکتا
گالوں پر سُرخی پھیلاتا

کس نے دیکھا

اِک سیّال سونے کا — ساگر
سُورج کی اکلوتی آنکھ سے ٹپ ٹپ گرتا
سارے جگ پر کرنوں کی برکھا برساتا
جھلمل کرتے پیلے پیلے پھُول ہزاروں
ہر پھیلے دامن میں گراتا
ہنستا، روتا، شور مچاتا!

سُورج کے آنے سے پہلے

بادل اوڑھ کے آجاؤں
برکھا بن کر برس پڑوں
سیپ میں اُتروں
گھاس پہ بکھروں
پھُول کے مکھ پر چمک اُٹھوں

پَر تولوں
اُڑتے اُڑتے
دُودھیا کُونجوں کے دھاگے میں
موتی بن کر دَمک اُٹھوں
تھک جاؤں

آنسو کی اِک بوند میں ڈھل کر
پلکوں سے آکاش کی، ٹپکوں
اِک جلتا انگارہ بن کر
مہندی والے ہاتھ پہ تیرے آن گروں
سورج کے آنے سے پہلے
وحشی سا اِک رقص کروں!!

دُکھ میلے آکاش کا

دُکھ کے رُوپ ہزاروں ہیں
ہَوا بھی دُکھ اور آگ بھی دُکھ ہے

مَیں تیرا تُو میرا دُکھ ہے
پَر یہ میلے اور گہرے آکاش کا دُکھ

جو قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے
اس دُکھ کا کوئی انت نہیں ہے!

جب آکاش کا دِل دُکھتا ہے
بچّے بوڑھے، شجر حجر، چڑیاں اور کیڑے
سب کے اندر دُکھ اُگتا ہے
پھر یہ دُکھ آنکھوں کے رستے
گالوں پر بہنے لگتا ہے

پھر تھوڑی کے پنچ ند پر سب دھارے آ کر مِل جاتے ہیں
اور شبنم سا مکھ دھرتی کا
خود اک دھارا بن جاتا ہے

سُنا بھی ہے
پہلے بھی اِک بار دُکھی آکاش کی آنکھیں ٹپک پڑی تھیں
پر دھرتی کی آخری ناؤ
زیست کی بکھری قاشوں کو چھاتی سے لگائے
پانی کی سرکش موجوں پر ناچ دکھاتی
دُور اُفق تک جا پہنچی تھی!

آج مگر وہ ناؤ کون سے دیس گئی ہے
دُکھ — میلے آکاش کا دُکھ
اب چاروں جانب اُمڈ پڑا ہے
قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے!

حادثہ

بے آواز تھے آنسو اُس کے
چھوٹے چھوٹے پیر تھے اُس کے
تن — جیسے رُوئی کا گالا
رنگ تھا کالا!

ندی کنارے تک پیروں کے
سارے نشان سلامت تھے
پار ندی کے کچھ بھی نہیں تھا

پار ندی کے کچھ بھی نہیں ہے
ساری راہیں ندیا کے اندر جاتی ہیں
اور پھر وہیں کی ہو جاتی ہیں
چھوٹے چھوٹے پیر برہنہ ریت کے اوپر پھول کھلا کر

ندی کنارے تک جاتے ہیں
اور پھر پار کہاں جاتے ہیں!

ہر بچّے کو
اُڑتی تتلی سرگوشی میں بتلاتی ہے
ماں تیری، ندیا کے اندر
دُودھ کا اک مشکیزہ لے کر
تیرا رستہ دیکھ رہی ہے!

کون بتائے ان بچّوں کو
ماں ندیا کے اندر کب ہے!
ماں تو خود اک تیز ندی ہے
ماں — اِک دُودھ بھری ندی ہے!!

برف

اب کچھ بھی نہیں، کوئی بات نہیں
اب رات کی پھیلی شاخوں پر
اِک بھی تو لرزتا پات نہیں!

اِک جھونکا تپتے صحرا کا
اِس پیڑ سے آ ٹکراتا تھا
ہر پتّہ شور مچاتا تھا
وہ جھونکا اب کس حال میں ہے
افلاک پہ ہے پاتال میں ہے؟
مَیں پیڑ کے نیچے گھٹنوں پر
کیوں سر رکھے تا دیر رہوں
اور اُس کی سندر چاپ سُنوں
جو رات کو روتا چھوڑ گیا

اور خوشبو سے مُنہ موڑ گیا
اب دُھول سنہری بکھری ہے
اور چاندکی چاندی نکھری ہے
اور شبنم ہنسی اُڑاتی ہے،
وہ باس کہ بھتی مُٹھی میں مکّیں
پوروں سے ٹپکتی جاتی ہے
اب کچھ بھی نہیں، کوئی بات نہیں
اِک برف مسافت دُور تلک!
اِک ٹھہری ساعت دُور تلک!

بُجھی راکھ کا انگ

کہا تُو نے : اے خستہ تن !
آگ نے مُجھ کو کُندن بنایا
تُجھے اِک لرزتا بکھرتا ہوا سرمئی سا بدن
ہے یہ کیسا مِلن ؟

کہا مَیں نے : اے روشنی کی کرن !
تُو میرے لئے تھی خیاباں
میں تیرے لئے مہرِ تاباں
تُو چاندی سے کُندن بنی
ایک سیّال سی دھات سے
دُوسری میں ڈھلی
قید پھر بھی رہی
اور مَیں

خشک لکڑی کا بَن
جب جلا، راکھ میں ڈھل گیا
کچھ سے کچھ ہو گیا
تیری فطرت، فقط رنگ سے رنگ تک
میری قسمت
بُجھی راکھ کے انگ تک
تُو ازل سے ابد تک جواں
مَیں اندھیرے کی بجھتی نسلوں میں
فقط ایک پل کی چمکتی ہوئی داستاں!

کہا تُو نے — اے خستہ تن!!

سیلِ بلا

جو سوچو
تو قرنوں کی اِس رہگزر پر
یونہی ایک نٹ کھٹ سا لمحہ رُکا
اپنے ٹوٹے ہوئے بُوٹ کی نوک سے
مُجھ کو ٹھوکر لگا کر
سڑک پر بچھی سُرخ بجری پہ مجھ کو گرا کر
پھر اِک بار
اِک تُند خو، سر پھرے، تیز جھونکے کی صورت روانہ ہُوا !

جو دیکھو

تو اِس ایک ٹھوکر سے میں
رہگزر کے سیہ رنگ کتبے پہ لکھا گیا
نقشِ پا تھا کبھی
نقشِ جاں ہو گیا
جاوداں ہو گیا!!

اِک نقش پیارا

سمندر سے مشکیزہ بھر کر وہ بادل پکارا:
کہاں ہیں پہاڑوں کی سوکھی چٹانیں
درختوں کے اکڑے ہوئے خشک ڈھانچے
تڑختی ہوئی شور کھیتوں کی مٹی؛
کہاں ہے وہ آنکھوں کی وحشت
لبوں پر لرزتی ہوئی پیاس کی لَو
دِلوں کی تجوری میں نفرت کی دولت؛
کہاں ہے
نحوست کے بے نُور ہالے میں جکڑا ہُوا
خوش نصیبی کا تارا؛

سمندر سے مشکیزہ بھر کر وہ بادل پکارا

تو انگڑائی لے کر فضا گنگنائی
ہوا سبز فرغل میں لہراتی آئی
فلک سے زمیں پر جھکا حسن سارا
زمیں کے شگافوں سے نکلے مصوّر
حسیں مُو قلم، شوخ رنگوں کا دھارا
معاً کھُردری، خشک دھرتی کے چہرے پہ بننے لگا
آنے والے زمانوں کا اِک نقش پیارا
وہ اِک خواب جس کو چمکتے ستاروں،
دہکتے ہوئے تیز رنگوں کا فرغل دلانے کی کوشش میں
ہم تُم نے عُمریں بتائیں
زمانہ گزُارا !!

آنکھ بھنوّر کی

سوچ اگر اِک ندّی ہوتی
دھرتی کے سینے پر بہتی
یا اِک اُڑتا پنچھی بن کر
مُجھ سے کہتی:
تُم کِن اُلجھے دھاگوں میں محبوس ہوئے ہو
کیوں اتنے مایوس ہوئے ہو؟

لہریں رقص کریں تو کیا ہے!
آگے بڑھ کر لوٹ آئیں گی
اپنے جیسی لاکھوں لہروں سے ٹکرا کر
جھاگ اُگلتا، چکراتا سا، ایک بھنور بن جائیں گی

اُور ہوائیں

دِل دہلا کر، چھتیں اُڑا کر، پیڑ گرا کر
کون سے دیس کو جائیں گی
جلد ہی لوٹ کے آ جائیں گی
جیسے کوئی بڑا ضروری کام ادھورا پڑا ہوا ہو!

سوچ کی لہریں — اندھی، قاتل!
اور ہوائیں
نشے کی حالت میں — گھائل!
مَیں، اک نُقطہ
مَیں وہ کھُلی ہوئی سی آنکھ کہ جس میں
ایک خَلا ہے
جس کے چاروں جانب اِک کُہرام بپا ہے!!

انسان

(۱)

دُھوپ کی چادر بچھی تھی سُو بہ سُو
اور پھٹے، گندے، سیہ پاؤں کے ساتھ
چل رہا تھا دُودھیا چادر پہ تُو
چیتھڑوں میں اُڑ رہی تھی کائنات
ریزہ ریزہ ہو رہے تھے کاخ و کُو
پھٹ رہے تھے بگڑلوں والے پہاڑ
بن رہی تھی پتھّروں کی آب جُو
زلزلوں کے ناگ تھے زیرِ زمیں
تھی سیہ گھوڑوں کی وحشت جن کی خُو
آسماں بیمار اور موسم خراب
گھاس کو گہنا رہی تھی گرم لُو،
اور تُو خود بُوئے گُل کی چاہ میں
پھر رہا تھا گھاٹیوں میں سُو بہ سُو
بُوئے گُل لیکن ہوا پر تھی سوار
اور ترا مرکب تھی تیری اپنی بُو

(ح)

تُو جنگل کی آگ تھی، تُو نے،
تیز ہَوا پر تخت بچھایا،
ہاتھوں پر چاندی پھیلائی
ماتھے پر چندن چپکایا،
سُرخ عروسی جوڑا پہنا
لال بھبھوکا مُکھڑا پایا
اسپِ سفید کی باگیں تھامیں
اور اس کو سرپٹ دوڑایا
بھُوری جنگلی گھاس پہ تُو نے
شعلوں کا قالین بچھایا،
پیڑ جلے، شاخیں کمھلائیں
اور پتّوں نے شور مچایا،
چیخ اُٹھے سب پنکھ پکھیرو
دوڑ گیا ہرنوں کا سایا
ایک انار سا چھوٹا لب پر
کرنوں نے کہرام مچایا
راکھ ہُوا نہ جب تک جنگل
تیرے مَن کو چین نہ آیا،

(ا + ح)

خستہ دِلوں کا قِصّہ سُنائیں کِسے کہ اب
ہنستے تڑپتے، بولتے لفظوں کی بات ہے
موجِ ہوائے قہر کی صورت ہے تُو رواں
شامل ترے جلوس میں ہر خشک پات ہے
بست و کشودِ چشم سے ہے دِل کا جزر و مد
ہونٹوں کے زیر و بم سے بندھی کائنات ہے
فُرصت کہاں کہ رُک کے سُنے تو کسی کی بات
مُٹھی میں تیری سلسلۂ شش جہات ہے
ڈوبے جو آفتاب تو تیری رضا ہے یہ
پھُوٹے سحر تو اس میں بھی تیرا ہی ہات ہے
اُوپر فلک ہے جس کی نہایت نہیں کوئی
نیچے زمیں ہے جس پہ فقط تیری ذات ہے!!

مَیں ایک ڈولتا ساگر مجھے اُٹھاتا کون
گھٹا اُٹھا کے چلی تھی مگر چلا نہ گیا